اداریہ

ہماری تعلیم اور زندگی

موجودہ وقت میں پاکستان کو پھر سے ایک سیاسی اور معاشی بحران کا سامنا ہے، سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد غربت کی لکیر کے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ بلکہ بہت سے لوگوں نے تو زندگی کی قید سے رہائی کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں موت کا پھندا بھی ڈال لیا ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے ہمارے موجودہ 'فلسفہ ہائے' اخلاق، سیاست اور معیشت کے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے۔

بے شبہ حالیہ فوجی حکومت، جو خود سیاست کے بازار میں آئی نہیں، بلکہ لائی گئی ہے، موجودہ بحران پر قابو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے، بدعنوان سیاست دانوں اور بددیانت سرکاری افسروں کو احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا، غریب کاشتکاروں سے جو صرف ۱۲ ایکڑ زمین رکھتے ہیں، لگان کا اُٹھا لینا، یا کم تنخواہ پانے والوں کے لیے بیت المال یا زکوٰۃ فنڈ سے مزید الاؤنس کا انتظام کرنا۔ غرضیکہ یہ مثبت باتیں اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن گزشتہ کئی دہائیوں پر محیط بدعنوانیوں پر قابو پانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں جمہوریت اور معیشت کو بحال کرنے کے لیے ایک مربوط اور ٹھوس پروگرام کی ضرورت ہے، وہاں ملک کے تعلیمی اداروں کی تنظیمِ نو کی بھی سخت ضرورت ہے، جو بدعنوان سیاست کے ہاتھوں اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں برصغیر کے ایک مردِ درویش نے کہا تھا: ''اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں، میدان ہائے جنگ کے بعد کون کون سی رہی ہیں، تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی اُٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے نام سے قائم کی گئیں۔'' اسی طرح اگر آج تاریخ سے پوچھا جائے کہ پاکستانی سوسائٹی کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں کن طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ تو یقیناً

اس کی انگلیاں اُن تمام درس گاہوں کی طرف اُٹھ جائیں گی، جن کے تقدس کو ہماری سیاست نے سیکولر ہو یا مذہبی، پامال کیا۔ اگر یہ درس گاہیں صحیح معنی میں دانش گاہیں ہوتیں تو آج ہم خود اپنے ملک اور دُنیا کے بازار میں رسوا نہ ہوتے۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں جب برصغیر میں نئی تعلیم کے لیے کالج کھولے گئے تو وقت کے ایک عارف باللہ قاری عبدالرحمٰن نے ان کالجوں کو مجھلے (جہالت کدے) کا نام دیا تھا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ پاکؐ نے فرمایا: ''خدایا! میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں، جو سودمند نہیں ہے، ایسے دل سے، جو عاجزی سے عاری ہے اور ایسے پیٹ سے جو سیر نہیں ہوتا۔'' کیا اس سے بہتر ہمارے بختِ واژگوں یا روزِ سیاہ کی کوئی تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پاکستان کے ہر دور میں ایسے دانشوروں کی ایک مختصر سی جماعت موجود رہی ہے، جو برابر اربابِ اقتدار کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکتی رہی۔ لیکن اربابِ اقتدار اپنے آپ کو ''عقلِ کُل'' تصور کرتے رہے۔ اُن کا طرزِ عمل برابر آمرانہ رہا، جو اُن کے دعویٰ ہائے جمہوریت یا اسلامیت کو جھٹلاتا رہا۔ یہی طرزِ عمل تھا، جس سے ملک کو سنگین بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا اور قوم کو نہ صرف دستوری حکومت سے بلکہ وطنِ عزیز کے ایک حصے سے بھی محروم ہونا پڑا۔ آفت پر آفت یہ آئی کہ اربابِ سیاست کی پے بہ پے ناکامیوں سے غریب عوام نے بھی کوئی سبق نہ لیا۔ وہ برابر اُنہی اربابِ سیاست پر اعتماد کرتے رہے۔ جنھوں نے اُنہیں بار بار دھوکہ دیا تھا۔ عوام کی سادگی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُنہیں جان بوجھ کر تعلیم سے محروم رکھا گیا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ یوں نظر آتا ہے کہ غریب عوام کو بھی بار بار دھوکہ کھانے میں مزا آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد بڑے دُکھ اٹھانے پڑے۔ اُنھوں نے اپنے ایک دوست قربان علی بیگ کو لکھا: ''آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کرلیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ غالب کے ایک اور جوتی لگی۔''

کچھ یہی حال ہمارا ہوگیا ہے کہ آج ہم آپ اپنے تماشائی بن گئے ہیں۔ اور اپنے

کو اپنا غیر سمجھ لیا ہے اور جب کبھی وقت کے ہاتھوں کوئی نئی آفت آتی ہے، تو خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، ''ایک اور جوتی لگی''، اور جو لوگ ہمیں بیدار کرنا چاہتے ہیں، اُن کی آواز کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ شیخ نظام الدین اولیاء صبح دم جا رہے تھے کہ مسجد سے یہ آیتِ کریمہ سنائی دی کہ کیا اہلِ ایمان پر ابھی تک یہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی یاد اور اس کی نازل کردہ سچائی (الحق) کے سامنے جھک جائیں۔'' شیخ نے آیتِ کریمہ کے سنتے ہی کہا کہ ہاں! وقت آ گیا ہے کہ سچائی کے سامنے سر جھکا دیا جائے۔ پھر ایک دُنیا نے دیکھا کہ حضرت شیخ ایک لمحہ میں عالم سے عارف بن گئے۔ کیا پے بہ پے اپنے ہی ہاتھوں زخم کھانے اور 'بجلیوں' کا 'نشیمن' بننے کے بعد ابھی تک وہ گھڑی نہیں آئی کہ ہم بیدار ہو جائیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کی آزادی سے بہت پہلے مسلم سوسائٹی میں تعلیم کا مسئلہ مسلم دانش مندوں میں برابر زیرِ بحث رہا اور اس بات پر سوچ بچار ہوتی رہی کہ قدیم اور جدید درس گاہوں میں پڑھایا جانے والا نصابِ تعلیم کس حد تک طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ایک اخلاقی انسان بنانے میں مدد دیتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ کہاں تک وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

یہاں یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ دارالعلوم، دیوبند کے اربابِ حل وعقد کے پیشِ نظر روایتی تعلیمی نظام، (درسِ نظامی) اور اسلام کے روحانی اور اخلاقی ورثے کی حفاظت تھی۔ علی گڑھ کے اربابِ نظر کا خیال تھا کہ تعلیم وقت کے جدید تقاضوں سے تغافل برت نہیں سکتی، لیکن ایک وقت کے بعد مسلمانوں کے اصحابِ بصیرت نے محسوس کیا کہ دونوں درسگاہوں سے نکلنے والے طلبہ کا طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مسلم معاشرہ دو قوموں میں بٹ کر رہ جائے گا۔

چنانچہ دارالعلوم کے معروف عالم مولانا محمود حسن، محمد علی جوہر، حکیم محمد اجمل، غرضیکہ اس پایہ کے اربابِ درد نے اس خلیج کو پاٹنے کے لیے ایک نئی دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا

خواب دیکھا اور علی گڑھ میں سیّد احمد خان کے دارالعلوم کی جامع مسجد میں ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو یہ خواب حقیقت بن گیا جب مولانا شبیر احمد عثمانی نے اربابِ علم کے سامنے اپنے استادِ محترم مولانا محمود حسن کا پیام سنایا۔ بعد میں یہ دانش گاہ دہلی منتقل ہوگئی۔ حکیم محمد اجمل دہلوی اس کے پہلے چانسلر تھے، اور محمد علی جوہر اس کے وائس چانسلر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے دانش ور ایک مدت تک اسی یونیورسٹی کے روحِ رواں رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، برصغیر کی شاید پہلی دانش گاہ ہے، جہاں قدیم اور جدید فکر میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کامیاب تجربہ کیا گیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے نصاب میں عربی ادب، تاریخ اور اسلامی ثقافت پر زور دیا گیا۔ اس دانش گاہ کے قیام میں بھی یہی احساس کام کر رہا تھا کہ قدیم اور جدید یا علی گڑھ کالج اور دارالعلوم دیوبند کے نقطہ ہائے تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ شبلی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علی گڑھ میں سرسیّد اور آرنلڈ کی صحبت سے اُن کی علمی شخصیت میں توازن اور اعتدال پیدا ہوا اور اُنہیں فقہی جمود و تعصب سے نجات ملی۔ وہ ندوۃ کو صحیح معنی میں فکری اور علمی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ افسوس! ندوہ میں قدامت پسند علماء نے ان کا ساتھ نہ دیا، جس کی وجہ سے ندوہ وہ مقام حاصل نہ کر سکا، جس کا خواب شبلی نے دیکھا تھا۔

ان دانش گاہوں کے قیام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم اہلِ علم کو نئے وقت کے تقاضوں کا احساس تھا، وہ جانتے تھے کہ قومی و ملی بقا کے لیے مسلم معاشرے کو کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے قومی ترقی و اصلاح کے لیے دانش گاہوں کے قیام پر زور دیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامہ کے بعد اہلِ ہند کو عموماً اور مسلمانوں کو خاص طور پر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اہلِ ہند برطانوی حکومت کی سیاسی اور فوجی برتری سے بہت مرعوب تھے جس کا اعتراف مسلمانوں یا ہندوؤں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں میں ملتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب زادہ آفتاب احمد خان مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موضوع پر

تقریر کرتے ہوئے کہا: ''پس اصلی تعلیم کا یہ کام ہے کہ ہمارے طالب علموں کی حقیقت بین طبیعتوں کو قومِ انگلش کے عالی صفات کے مطالعہ کا موقع دے... ضرورت اس کی ہے کہ انگریزوں کے متعلق صحیح حالات ہمارے نوعمروں کو معلوم ہوں۔ یہی وہ اصول ہے جو ابتداء سے علی گڑھ کالج کی تعلیم میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انگلش اخلاق کے اعلیٰ نمونے شروع سے طلبہ کے پیشِ نظر رکھے گئے ہیں۔''[1]

ایک طرف علی گڑھ کالج کے لیے صاحبزادہ آفتاب احمد انگلش اخلاق کے ''اعلیٰ نمونے'' تجویز کر رہے تھے۔ دوسری طرف ندوۃ العلماء، لکھنؤ نے اپنے ایک اجلاس کانپور مورخہ ۱۲ر محرم ۱۳۱۳ھ میں یہ طے کیا: ''(۱) تمام طالبعلموں کا ایک اسلامی لباس ہوگا اور وہ خاص شرفائے عرب کے طور پر ہوگا۔ (۲) تمام طلبہ عرب کے طریقے پر کھانا کھائیں گے۔''[2]

یوں نظر آتا ہے کہ ندوۃ العلماء نے علی گڑھ کالج کے جواب میں 'شرفائے عرب' کے اسلامی لباس کو اپنے طالب علموں کے لیے پسند کیا۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے طالب علموں کے لیے ان دونوں میں سے کسی راہ کو اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ایک نئے عزم سے پرانی علمی روش پر چلتا رہا۔ خدا سرشاری اور حسنِ اخلاق پر زور دیتا رہا۔ ہرچند دارالعلوم سیاست میں ترقی پسند موقف کا حامل رہا لیکن علم الکلام میں قرونِ وسطیٰ کے فکر سے آگے نہیں بڑھا اور نہ ہی اس نے اپنے نصاب میں عہدِ حاضر کی مذہبی سوچ، اس کی تاریخ اور سرگرمیوں کو جگہ دی۔

قدیم اور جدید سے متعلق دونوں نقطۂ ہائے نظر پر تنقید کرتے ہوئے ابوالکلام نے لکھا: ''آج مسلمانوں میں دو ہی طرح کے رہنما ہیں... قدیم گروہ کے لیے پرانے علماء اور نئے گروہ کے لیے نئے لیڈر۔ دونوں مذہب سے بے خبر اور ملت کے لیے عضوِ مسموم۔ پہلا قریب

۱۔ رسالہ کانفرنس، علی گڑھ (۱۹۱۱ء)، ص ۱۸-۱۹، نیز دیکھئے: دارالعلوم، دیوبند، ایک ناقدانہ جائزہ، اسلام آباد (۱۹۸۹ء)، ص ۱۵۹-۱۶۰

۲۔ ایضاً (دارالعلوم، دیوبند)، ص ۱۶۱

رہ کر پیاسا ہے اور دوسرا پانی تک پہنچا ہی نہیں۔

اسے کشتی نہیں ملتی، اسے ساحل نہیں ملتا

پہلا مذہبی توہمات اور تعصب و جمود میں مبتلا، دوسرا فرنگی مآب اور جاہ پرستی میں گرفتار۔'' [الہلال، اگست ۱۹۱۲ء]

اقبال نے بھی جو قدیم روایتی تعلیم اور جدید مغربی نظامِ تعلیم کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ مغربی تعلیم پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ انہوں نے بجا طور پر کہا کہ ''یہ انسانی روح کو انسانیت سے عاری کر کے اسے اپاہج بنا دیتی ہے۔'' خود مرحوم سرسیّد بھی علی گڑھ کی پہلی نسل سے خوش نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی، شبلی اور اقبال نے علی گڑھ کی پہلی نسل کو غیر تخلیقی اور سوسائٹی کے لیے غیر مفید قرار دیا۔ شاید یہی وجہ ہے، ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان اس طبقے پر 'مغرب زدہ' کی پھبتی کستے تھے۔ اقبال نے سچ کہا تھا:

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح تیرا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند تیرا نشتر تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

غرضیکہ اربابِ دانش ہماری تعلیمی پالیسی اور اس کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا تو پاکستان کے اربابِ سیاست کو اس بات کا احساس تھا کہ نئی ریاست کی ترقی اور خوش حالی ایک بامقصد تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بانیٔ پاکستان نے ۱۶/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ماہرینِ تعلیم اور اسمبلی کے ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اب ہم نے اپنی ریاست حاصل کر لی ہے۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ تعلیم کے لیے ایک قابلِ عمل، تخلیقی اور ٹھوس پروگرام تیار کریں، جو ہماری ضروریات کے مطابق ہو اور ہماری تاریخ اور ہمارے قومی مقاصد کا ترجمان۔'' اس تبصرے سے عیاں ہے کہ قائد ایسا تعلیمی نظام چاہتے تھے، جو نہ صرف ہمارے تاریخی فکر کا ترجمان ہو،

بلکہ ہمارے اپنے عہد کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ چنانچہ جب نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں پہلی قومی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو پاکستان کے پہلے وزیرِ تعلیم جناب فضل الرحمٰن نے اپنے افتتاحی خطاب میں تعلیم و تربیت اور اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کرتے ہوئے کہا: ''اسلام ہمیشہ سے سوشل جمہوریت اور مکمل سماجی انصاف کا داعی رہا ہے۔ نظامِ تعلیم پر بجا طور پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ یہ نظام حقیقت سے عاری ہے اور تیزی سے بدلتی ہوئی سوسائٹی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر۔ اس نظامِ تعلیم کو نہ تو کسی بلند نظریہ یا فکر سے کوئی رہنمائی ملتی ہے، اور نہ ہی یہ ٹھوس اخلاقی اصولوں اور دانشورانہ روایات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طالب علموں میں اس اخلاقی اور فکری نظم و ضبط کی تلقین کرنے سے قاصر رہا ہے، جو ہماری ثقافت (Culture) کا طرۂ امتیاز ہے۔

وزیرِ موصوف (فضل الرحمٰن صاحب) نے اپنے سامعین سے کہا کہ آپ مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے کہ ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر کو آفاقی ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ طالب علموں کو شہریت کی ذمہ داریوں کی تربیت بھی دی جانی چاہیے، کیوں کہ اس تربیت کے بغیر وہ (طالب علم) ایک بچے کی طرح ہے، جو آتشیں اسلحہ سے کھیلتا ہے چنانچہ شہریت کی تربیت کے فقدان سے کرپشن اور سیاسی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اپنے خطاب میں فضل الرحمٰن صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جدید دور میں نظامِ تعلیم کو کن بنیادوں پر استوار کیا جانا ضروری ہے۔

بے شبہ وزیرِ تعلیم کا یہ خطاب فلسفۂ تعلیم سے باخبر وزیرِ تعلیم کا خطاب تھا، جو نئی ریاست کے کردار اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہے۔[1] افسوس! کہ تعلیم و تربیت سے متعلق قائد اور ان کے ساتھیوں کا یہ خواب حقیقت نہ بن سکا۔ شاید اس لیے کہ بانیٔ پاکستان قیامِ پاکستان کے ایک سال کے بعد رحلت کر گئے اور اُن کا پورا وقت نئی ریاست کے ہنگامی حالات اور بھارت سے آنے والے ان لاکھوں پناہ گزینوں کے مسائل کی نذر ہو گیا جنہیں بڑی بے رحمی سے فسطائی طاقتوں نے اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا۔ یہ المیہ پاکستان میں بھی دہرایا گیا،

---

[1] New Education in the Making in Pakistan (London, 1953), pp.3-15.

جس پر وہ رنجیدہ اور دکھی تھے۔

بہرحال پاکستان کی دانش گاہوں میں ایسا نظامِ تعلیم اپنایا نہ جا سکا، جس کا خاکہ جناب فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے وقیع خطاب میں بیان کیا تھا۔ حتیٰ کہ خود مسلم لیگ ہی کے ایک دانش ور مرحوم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ہماری دانش گاہوں سے فارغ ہونے والے طالب علموں کی فکری و عملی پستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''ہمارا سیکولر تعلیم یافتہ گروہ دُنیا میں سب سے زیادہ نکما، انتہائی غیر ذمہ دار، اور مادی اغراض کے لیے کام کرنے والا ہے... اس ربع صدی میں کیا غلطی ہوئی ہے، جس نے ہماری سوسائٹی کو کھوکھلا کر دیا ہے... یہ (نظامِ تعلیم) ایک فرسودہ، بے مقصد نظامِ تعلیم ہے، جو اپنے سامنے کسی سماجی نیکی، جذبہ کی گہرائی اور ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتا۔ اس (نظامِ تعلیم) نے خود غرضی، بدعنوانی (Corruption) اور بزدلی، جو آدمی کو قدم اٹھانے اور ہمت و جرأت سے کام لینے سے روکتی ہے، کے سوا کچھ نہیں دیا۔''[1]

یاد رہے کہ یہ الفاظ اس دانشور کے قلم سے نکلے ہیں، جو نہ صرف ملک کے وزیرِ تعلیم بلکہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جہاں جدید تعلیم کو بانجھ قرار دیا ہے، وہاں وہ مدرسہ کی قدیم تعلیم سے بھی خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مدرسہ کی تعلیم نے مساجد کے لیے کم تنخواہ والے، کم تعلیم یافتہ اور کم معلومات والے امام تو مہیا کر دیئے، لیکن مدرسہ کی تعلیم طالب علموں میں ''مذہبی شعور و بصیرت'' پیدا کرنے میں ناکام رہی۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ پاکستان کے موجودہ تعلیمی نظام پر ڈاکٹر قریشی کی تنقید بجا، لیکن اس بات کا کیا جواز ہے کہ انہوں نے خود کراچی یونیورسٹی میں جب وہ اس کے وائس چانسلر تھے، جمعیت طلبہ اسلامی کی سرپرستی کی ہے اور عذر یہ پیش کیا ہے کہ یونیورسٹی میں بائیں بازو کی تحریک کو روکنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔[2] واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر قریشی اپنی

۱۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب Islam and Modernity، شیکاگو یونیورسٹی، (۱۹۸۲ء) میں مسلم دنیا اور پاکستان کے نظامِ تعلیم پر تفصیل سے بحث کی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے، ص ۱۱۷-۱۱۸

۲۔ ایضاً

دانش وری اور سنجیدگی کے باوجود تعلیم و تربیت یا ثقافت کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ کیوں کہ ''سیاست'' سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُن کے سنجیدہ افکار کبھی کبھی صحافیانہ سطح پر بھی اتر آتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو انہوں نے بہ قول فضل الرحمٰن، جمعیت طلبہ اسلامی کی سرپرستی کی۔ جس سے یونیورسٹی کی فکری اور سنجیدہ فضا مکدر ہوئی۔ دوسری طرف انہوں نے ''پاکستانی کلچر'' کے موضوع پر لکھتے ہوئے ''مروجہ سیاست'' کا سہارا لیا۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۵۴ء میں U.S.A. میں اسلامی ثقافت سے متعلق ایک سیمینار میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا: ''آئندہ سو سال میں شاید اس سے بھی کم مدت میں بھارت میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔''[1] اس قسم کے خیالات کا اظہار سیاسی سٹیج پر تو شاید گوارا کیا جا سکے، لیکن فلسفہ و علم کی سنجیدہ دُنیا میں اس اندازِ فکر کو پسند نہیں کیا جاتا۔

صحیح بات یہ ہے کہ پروفیسر قریشی جس حکومت کے وزیر تھے، وہ بھی زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا نہیں کرتی تھی۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں اسمبلی کے ایک بنگالی ممبر نے وزیراعظم سے کہا کہ اسمبلی میں جہاں انگریزی اور اردو میں بولنے کی اجازت ہے، وہاں بنگالی میں بھی بولنے کی اجازت دی جائے۔ مرحوم لیاقت علی خان نے کہا: ''پاکستان برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبہ پر وجود میں آیا ہے۔ اور برصغیر میں دس کروڑ مسلمانوں کی زبان صرف اردو ہے۔'' بے شبہ اردو برصغیر کی ادبی اور ثقافتی ترقی یافتہ زبان ہے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد بنگالی زبان کی قانونی حیثیت کو تسلیم نہ کرنا، جب کہ اہلِ پاکستان کی اکثریت کی زبان بنگالی تھی، ایک سیاسی بھول تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب خرابیٔ بسیار کے بعد بنگالی زبان کو بھی قومی زبان تسلیم کیا گیا اور اردو اور بنگالی ادب کی تاریخ لکھی جانے لگی تو بنگالی بورڈ کے چیئرمین کو پیغام بھجوایا گیا کہ بنگالی ادب کی تاریخ لکھتے وقت ہر ممکن کوشش کی جائے کہ بنگالی ادب میں ٹیگور کا اثر ختم کیا جائے۔ جب بورڈ کے صدر جسٹس مرشد نے یہ پیغام سنا تو اس نے حفیظ کاردار سے کہا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آپ لاہور میں تانگہ والے کی زبان بولیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو، مسلم ورلڈ (Muslim World)، امریکہ، (جنوری، ۱۹۵۴ء)، ص ۸

انگریزی ادب کی تاریخ لکھی جائے اور اس میں شیکسپیئر کا ذکر نہ ہو؟ خدارا بتاؤ! کہ کیا ٹیگور کے بغیر بنگالی ادب کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔[1]

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری سوچ کس حد تک زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ کیا یہ طرزِ فکر یا طرزِ عمل ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کر سکتا ہے؟ کیا تنگ نظری، تعصب اور نفرت کی بنیادوں پر کوئی قوم تاریخ کے سٹیج پر مثبت کردار ادا کر سکتی ہے؟

افسوس! مسئلہ تعلیم پر بات طول پکڑ گئی، لیکن بات ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ اگر جدید تعلیم ایک صحت مند، بیدار مغز اور بلند نظر اخلاقی نسل پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے تو قدیم تعلیم بھی مَعاشرے میں مذہبی شعور و بصیرت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں رہی۔ آج مذہب کے مقدس نام پر فرقہ واریت، تشدد اور نفرت کی جو 'تبلیغ' کی جا رہی ہے، کیا اس کا مذہب، اخلاق اور بلند اقدار سے کوئی واسطہ ہے؟۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ ہمارے معاشرتی مسائل الجھ کر رہ گئے ہیں اور ہمارے ''علماء'' ہیں کہ ان مسائل کو سلجھانے کی بجائے ''غزوۃ ہند'' کے نام پر پانی پت کی 'چوتھی جنگ' لڑنے کی تلقین فرما رہے ہیں!!

اب سوال یہ ہے کیا حکومت کی نگہ التفات ملک کی دانش گاہوں کی طرف بھی اٹھے گی؟ وقت آ گیا ہے کہ ہم ان دانشوروں کے نقش قدم کو اپنائیں، جنہوں نے غلام برصغیر میں مسلم معاشرے کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے بڑی محنت، لگن اور دیدہ وری سے شب و روز کام کیا تھا۔ **فھل من مدّکر؟** (کیا کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟)

رشید احمد (جالندھری)

---

[1] Failed Expectations، لاہور (۱۹۹۵ء)، ص ۳۳